ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیے میں تہذیبی عناصر

ڈاکٹر صفدر رنعیم*

Abstract:

Dr.Wazir Agha was a poet, an eminent critic, researcher, editor and thought provoking light essay writer. He served a lot for the development of light essay in Urduliterature and he also wrote many articles regaurding formation of light essay. There is a large number of books in his credit. The purpose of this review, is to find out the cultural elements in light essays by Dr.Wazir Agha.

ڈاکٹر وزیر آغا نہ صرف شاعر، نقاد، محقق اور باشعور مدیر ہیں بلکہ ایک فکر انگیز انشائیہ نگار بھی ہیں۔ ان کے انشائیوں کے چار مجموعے چھپ کر قارئینِ علم و ادب سے داد و تحسین وصول کر رہے ہیں۔ انشائیے کو پہچان کی منزل تک لانے کے لیے اُن کی کامیاب کوشش کا تذکرہ تاریخِ ادب کے اعتراف کا ایک حصہ ہے۔ انہوں نے نہ صرف انشائیے تخلیق کیے بلکہ پورے ادراک کے ساتھ انشائیے کے اصول و اسالیب اور خدوخال کو بھی واضح کیا۔ یہ انہی کی مساعیٔ جمیلہ ہے کہ اب عام قاری بھی انشائیے سے مکمل آگاہی رکھتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے ڈاکٹر وزیر آغا کو انشائیے کا موجد اور خاتم قرار دیا ہے۔ (۱) مداحین اور معترضین کا پیدا ہو جانا ایک فطری عمل ہے چنانچہ ڈاکٹر وزیر آغا کی اس تخلیقی کاوش کو جھٹلانے کے لیے بڑے بڑے حربے استعمال کیے گئے۔ کسی نے انشائیہ کی اختراع کے بارے میں ان پر ملامت کی، کسی نے کہا انشائیہ مجذوب کی بَڑ ہے، کسی نے کہا انشائیہ محض ''اوراق'' اور اس کے مدیر کی پروردہ صنف ہے۔ بعض اصحاب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ انشائیہ تخلیقی صنف کے زمرے میں ہی شامل نہیں ہے۔ حیدر قریشی کا کہنا ہے کہ جب مولانا صلاح الدین نے وزیر آغا کے انشائیوں کو اردو ادب کی جدید ترین صنف قرار دیا اس وقت انشائیہ کا کوئی نام نہاد آگے نہیں بڑھا، اب ہر کوئی سہرا اپنے سر باندھنے پر تلا ہوا ہے۔ (۲) بہر کیف ہمیں ان

* شعبہ اُردو، گورنمنٹ شالیمار کالج، لاہور

اعتراضات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ان کے انشائیے میں تہذیبی پہلوؤں کو تلاش کرنا ہے۔

انگریزی ادب میں جو صنف Light Essay سے موسوم ہے اردو ادب میں اس کے لیے انشائیہ کی اصطلاح مستعمل ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں عالمی ادب کی تاریخ میں یہ صنف پہلے فرانسیسی ادب میں آئی اور اس کے بانی مونٹین (Montain) کی تقلید میں انگریزی انشا پرداز بیکن (Bacon) نے اسے انگریزی میں رائج کیا اور پھر دیکھتے دیکھتے اسے اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس زمانے کے ہر قابلِ ذکر ادیب نے اس صنفِ ادب میں خامہ فرسائی کی اور اس میں ادبی نقوش چھوڑے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اپنی ایک تصنیف میں لکھتے ہیں:

> ''انشائیہ کی ابتداء مونٹین نے کی۔ مونٹین غیر افسانوی نثر کو تخلیقی سطح پر لانے کا آرزومند تھا تا کہ وہ انکشاف ذات کا ذریعہ بن سکے نیز کاروباری سطح سے اُٹھ کر ادبی سطح پر آجائے۔ اس نے اپنے اس دلچسپ اور نادر تجربے کے ثمر کو Essays کا نام دیا۔ یہ تحریر کا ایک ایسا نمونہ تھا جس کی مثال پہلے کہیں موجود نہیں تھی۔ مناسب تھا کہ اس نئی چیز کو نام بھی نیا تفویض کیا جاتا تا کہ وہ علمی، سائنسی، مذہبی اور فلسفیانہ مضامین سے الگ نظر آ سکتی۔ مونٹین نے یہ کام سرانجام دیا لیکن جلد ہی اس نئے نام کے سلسلے میں ایک ایسا المیہ ہوا کہ انشائیہ کے خاص پیکر کی اٹھان معرضِ خطر میں پڑ گئی۔ ہوا یوں کہ ادھر مونٹین نے یہ لفظ اختراع کیا اُدھر زمانے نے اسے اس فراخ دلی سے قبول کر لیا کہ اکثر لوگ اپنی سنجیدہ، ٹھوس اور بعض اوقات اپنی انٹ شنٹ تحریروں کو بھی ''ایسے'' کے نام سے پیش کرنے کی کوشش کرنے لگے۔''(۳)

ڈاکٹر جانسن نے لکھا ہے کہ انشائیہ ذہن کی ایک ترنگ ہے۔(۴): ڈاکٹر سید حامد حسین اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر جانسن نے ''ایسے'' کو انسانی ذہن کی آزاد ترنگ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تعریف اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ انشائیہ انسان کے مربوط منطقی خیالات کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی ذہن کی لطیف تخلیقی تحریکات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔(۵) ڈاکٹر جانسن کی انشائیے کی متعین کردہ تعریف ایک لمحے کے لیے مسرور کر دیتی ہے۔ اس سے ہمیں شعر کی لطافت کا احساس ہوتا ہے اور ہم اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ واقعی انشائیہ ذہن کی ترنگ ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ترنگ، کسی ذہنی کیفیت کا نام ہے۔ ہمیں خیالات کا شیرازہ بکھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بعض انگریزی ادیبوں نے انشائیہ کو غزل کی خصوصیات کا مالک سمجھا ہے۔ الیگزنڈر سمتھ اپنے مقالے "On the writing oe an essay" میں انشائیے کو غنائی نظم سے مشابہت دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "The essay as a literary form, resembles the lyric, in so far as it is moulded by some control mooh-whimsical, serious or satirical. Give the mood, and the essay, from the first sentence to the last, grows around it as the cocoon grows around the silk

worm."**(6)**

اس تعریف میں انشائیے کو غنائی نظم سے تشبیہ دی گئی ہے۔ انشائیے کو سنجیدہ، مزاحیہ اور طنزیہ مضمون بھی کہا گیا ہے۔ مزید یہ کہ اس کے تمام جملے شروع سے لے کر آخر تک ایک ہی خیال کو پیش کرتے ہیں۔ مغرب میں Lyric خالص انفرادی اظہار کے لیے مخصوص ہے۔ اس میں شاعر واردات قلبی کو کمالِ خلوص سے پیش کرتا ہے۔ جمیل آذر نے تو انشائی تنقید کی بھی بنیاد ڈال دی ہے۔ ان کے خیال میں انشائی نقاد فن پارے کا مطالعہ خلوص دل، غور و فکر اور ارتکاز ذہن کے ساتھ کرتا ہے۔ دوسروں کو اس پر کیف تجربے میں شامل کرنے کی سعی انشائی تنقید ہے، جو مشکل بھی ہے اور دلچسپ بھی۔(۷) اسی طرح انشائیہ، ادب کی شخصیت کا ایک بے تکلف اور مؤثر اظہار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا انشائیے کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''ایک چیز جو انشائیہ کو دوسری اصناف ادب سے ممیز کرتی ہے، اس کا غیر رسمی طریق کار ہے۔ دراصل انشائیہ کے خالق کے پیش نظر کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لیے وہ دلائل و براہین سے کام لے اور ناظر کے ذہن میں ردو قبول کے میلانات کو تحریک دینے کی سعی کرے۔ اس کا کام محض یہ ہے کہ چند لمحوں کے لیے زندگی کی سنجیدگی اور گہما گہمی سے قطع نظر کر کے ایک غیر رسمی طریق کار اختیار کرے اور اپنے شخصی ردعمل کے اظہار سے ناظر کو اپنے حلقہ احباب میں شامل کر لے۔۔۔ اور انشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر سے چھٹی کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے، چست اور تنگ سا لباس اُتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے اور ایک آرام دہ موڑھے پر نیم دراز ہو کر اور حُقہ کی نے ہاتھ میں لیے انتہائی بشاشت اور مسرت سے اپنے احباب سے مصروفِ گفتگو ہو جاتا ہے۔ انشائیہ کی صنف اسی شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے اور اس کے تحت انشائیہ کا خالق نہ صرف رسمی طریق کار کی بجائے ایک غیر رسمی طریق کار اختیار کرتا ہے بلکہ غیر شخصی موضوعات پر نقد و تبصرے سے کام لینے کی بجائے اپنی روح کے کسی گوشے کو بے نقاب اور اپنے شخصی ردعمل کے کسی پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔''**(۸)**

اگر ڈاکٹر جانسن اور ڈاکٹر وزیر آغا کی متعین کردہ آراء کا موازنہ کیا جائے تو دونوں آراء میں کوئی خاص فرق معلوم نہیں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے کہ انشائیہ نگار انشائیہ لکھتے وقت کوئی تنقید یا تبصرہ نہیں کر رہا ہوتا بلکہ وہ ایک آزاد ماحول میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے کسی پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔ اپنے علمی تبحر کے ذریعے بہت سی باتیں قاری کے گوش گزار کرتا ہے۔ بنیادی طور پر انشائیہ نگار کا کام ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہے۔ اس کے لیے وہ طنز سے کچھ زیادہ کام نہیں لیتا۔ اچھے انشائیے میں طنز ایک ''سہارے'' کا کام دیتی ہے۔ انشائیہ کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس کی عدم تکمیل ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے خیال میں انشائیہ کا ایک اور بنیادی وصف اس کا اختصار ہے۔ سانیٹ کی طرح انشائیہ کا بھی ایک مختصر سا میدان ہے جس کے اندر انشائیہ لکھنے والا تصویر کا

ایک مخصوص رُخ دکھاتا ہے۔ایک آخری چیز جسے انشائیہ کا امتیازی وصف سمجھنا چاہیے۔اس کی ''تازگی'' ہے یوں تو تازگی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کے بغیر کوئی بھی صنف ادب اعلیٰ مدارج تک نہیں پہنچ سکتی۔انشائیہ میں اس کا بھرپور مظاہرہ ہوتا ہے۔انشائیہ میں تازگی کی کمی اس کو اس کے فنی مقام سے نیچے گرا دیتی ہے۔تازگی سے مراد صرف ابلاغ کی تازگی نہیں بلکہ موضوع اور نقطۂ نظر کا وہ انوکھا پن بھی ہے جو ناظر کو زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھا کر ماحول کا ازسرِنو جائزہ لینے پر مائل کرے۔انشائیہ کے بنیادی محاسن کو اُجاگر کرنے کے بعد قدرتی طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اُردو میں انشائیہ کی صنف کے بارے میں تحقیق کی جائے مگر ہمیں ماضی کی گتھیوں میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اُردو میں انشائیہ نگاری کی پہچان ہیں۔انہوں نے نہ صرف اس صنفِ ادب کو سنوارا بلکہ بہت سے انشائیہ نگار بھی پیدا کئے ہیں۔ان کی ادبی جہات کے حوالے سے مشتاق احمد یوسفی کا کہنا ہے کہ تقریر ہو یا تحریر، تنقید ہو یا تقریظ، نظم ہو یا انشائیہ، ڈاکٹر وزیر آغا ہر رنگ میں اپنے انداز سے پہچانے جاتے ہیں۔ان کی طبیعت میں جو دل آویز نرمی، رچاؤ اور شائستگی ہے، زمین اور اس کے رشتوں کو انہوں نے جس طرح چاہا اور نبھایا ہے، وہ ان کی ایک ایک سطر سے جھلکتا ہے۔سخت سے سخت بات کو بڑے دھیمے انداز میں کہہ جاتے ہیں۔مزاح اُن کے لیے سیف نہیں، سپر ہے۔روزمرہ کے واقعات و تاثرات کو وہ اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور تیکھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ان کے خیال میں ڈاکٹر وزیر آغا اردو انشائیہ کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔اس دور میں پڑھنے والوں کو سیروں کے حساب سے بکنے والے ناولوں کا چسکا پڑ گیا ہے۔اتنے مختصر مضامین پڑھنے اور لکھنے والوں، دونوں کی، کم نصیبی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کے مضامین (Essays) تازگی و توازن اور فکر و نظر کے لحاظ سے اُردو ادب میں یادگار رہیں۔(۹) اُردو انشائیہ کے ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا کا نام یوں منسوب ہو گیا ہے کہ اب اُن کے ذکر کے بغیر اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔انہوں نے نہ صرف اس صنفِ اظہار کو وسیع پیمانے پر متعارف کرایا بلکہ اس کے اصول بھی وضع کیے۔ڈاکٹر انور سدید اُن کے انشائیے میں تہذیبی عناصر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اُردو کے انشائیہ نگاروں میں وزیر آغا کو یہ امتیاز تو حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے زیادہ شگفتہ انشائیے لکھے ہیں، ان کے موضوعات میں تنوع اور بوقلمونی ہے۔۔۔ان کی انفرادیت کا سب سے اہم پہلو ان کی تہذیبی شخصیت ہے جس کی نمود انشائیے میں متعدد زاویوں اور ان گنت قرینوں سے ہوتی ہے۔اس شخصیت کا خمیر دریائے جہلم کے میٹھے شفاف پانی اور دریائے چناب کے طاس کی معطر سوندھی مٹی سے اٹھا ہے۔وزیر آغا نے اس دھرتی سے گندم اور کپاس پیدا کی ہے تو اس مٹی سے آموں کے بور لگے چھتنار اور دھرتی کا زرسمیٹے پیلے مالٹوں کے شاخسار بھی لگائے ہیں۔یہ شاخسار جب کھلی فضاؤں میں لہلہاتے ہیں تو سورج کا تمام سونا اپنے جسم میں جذب کر لیتے ہیں، فطرت کے اس زاویے نے وزیر آغا کے ہاں ارضی رشتوں کی اہمیت کا احساس پیدا کیا ہے۔''(۱۰)

اس اقتباس سے یہ واضح ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں انشائیے میں بھی تہذیبی وثقافتی عناصر نے جگہ پائی ہے۔اُن کے انشائیے تہذیب کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔وہ تہذیب کی اُفقی سطح پر سفر کرتے کرتے عمودی جست لگاتے ہیں اور قاری کو مختلف مقامات اور مناظرِ فطرت کی سیر کرواتے ہیں۔اس دوران میں وہ یہ احساس بھی رکھتے ہیں کہ اُن کے پاؤں زمین پر ہیں۔ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں کہ ان کے انشائیوں کا خام مواد بھی بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔یہ خام مواد انہوں نے دیہاتی زندگی اور اس عظیم ثقافتی ورثے سے حاصل کیا ہے جو صدیوں کا سفر طے کر کے ان تک پہنچا ہے۔طبیعت کی نفاست اور ان کی تہذیبی شخصیت کی یہی خوبیاں ان کے انشائیوں کی بنیادی پہچان ہیں۔(۱۱) یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا منظر کے حُسن کو ایک ہی سانس میں اپنے دل میں اُتارنے کی کوشش نہیں کرتے۔وہ آہستہ آہستہ اسے اپنے جسم کے رگ وپے میں اترنے دیتے ہیں اور پھر مستقل طور پر اسے اپنے دل کے مکان میں ایک خوبصورت کمرہ الاٹ کر دیتے ہیں۔ان کے اس رجحان نے ان کے ہاں آہستہ خرامی کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ان کی رفتار فطری ہے۔ان کے نزدیک فطرت کے بھیدوں سے آگاہی کا بڑا ذریعہ دیہات ہے۔انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دیہات میں ہی گزارا ہے۔بلاشبہ وہ لاہور میں آ کر بھی رہتے رہے۔پھر انہوں نے لاہور میں اپنا ذاتی مکان بنالیا۔بقول ڈاکٹر انور سدید ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت دیہات اور شہر کا سنگم نہ بن سکی بلکہ وہ دیہات کو اپنے کندھے پر اٹھائے پھرتے ہیں اور شہر کے ہنگاموں میں کھوئے ہوئے لوگوں کو دیہات کا سندر روپ دکھانے اور اس کا مدھر نغمہ سنانے میں مصروف ہیں۔ان کے انشائیے میں دیہات کی ایک مدھم لے اُٹھتی اور قاری کو دیہاتی ماحول میں اٹھالے جاتی ہے اور اُسے فطرت کے سامنے لے جا کھڑا کرتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے آغازِ کار ہی میں انشائیہ کو ایک خاص اسلوب اور ایک خاص رُخ سے روشناس کیا۔یہ اسلوب، یہ مزاج اور یہ رُخ ایسا دل آویز شستہ اور جاندار تھا کہ اس کی وسیع پیمانے پر تقلید کی گئی اور کئی ایک انشائیہ نگاروں نے رفتہ رفتہ ذات وکائنات کے مختلف رنگوں کے آمیزے سے نئے اور انوکھے اسالیب تراشے ہیں۔ڈاکٹر موصوف اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''میں اسے امتزاجی صنف کا نام دیتا ہوں جس میں کہانی کا مزہ،شعر کی لطافت اور سفرنامے کا تحرک یکجا ہوگئے ہیں۔تاہم انشائیہ محض ان اوصاف کی ''حاصل جمع'' کا نام نہیں ہے وہ ان سب کو اپنے اندر جذب کر کے خود ایک ایسی اکائی بن کر نمودار ہوتا ہے جس کی انفرادیت ان جملہ اوصاف کی حاصل جمع سے کچھ ''زیادہ'' ہوتی ہے۔اس اعتبار سے انشائیہ کا ایک اپنا سٹرکچر ہے، جو سٹرکچرنگ Structuring کے عمل کو بروئے کار لا کر سدا نئے نئے امکانات کی طرف پیش کرتا ہے۔''(۱۲)

یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیے میں کہانی کا مزہ،شعر کی لطافت اور سفرنامے کا تحرک پیدا کر دیا ہے۔مزید یہ کہ انہوں نے دھرتی رنگ اور باس کو بھی انشائیے کا لازمہ سمجھا ہے۔ان کے انشائیوں کے عنوان اور ان کا علمی مواد بھی تہذیبی بوباس لیے ہوئے ہے۔اُن کا کوئی بھی انشائیہ ایسا نہیں ہے جس کا تعلق بلاواسطہ یا بالواسطہ

دھرتی سے نہ ہو۔ان کا انشائیہ ''چوری سے یاری تک'' ہماری تہذیبی اقدار کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

''چوری ہمارا پیشہ ہی نہیں، مشغلہ بھی ہے اور ہم نے لیل ونہار کی ہزار کروٹوں کے باوجود نہ صرف اسے زندہ رکھا بلکہ اس میں لاتعداد موشگافیاں اور فنی باریکیاں بھی پیدا کی ہیں۔ دروغ بر گردنِ راوی، لیکن یہی سنا ہے کہ ہمارے اس پیشے کا ذکر رگ وید میں بھی موجود ہے۔ آریا جب ہم پر حملہ آور ہوئے اور ہمارے قلعوں کو برباد کرتے چلے گئے تو جواباً اور انتقاماً ہم نے بھی ان کے مویشی چرانے شروع کر دیئے۔ وہ سارا دن لڑنے بھڑنے کے بعد جب رات سے آرام کرتے تو ہم شب خون مار کر ان کے مویشی اُڑا لے جاتے۔۔۔ سچ یہ ہے کہ ہم نے اپنے پیشے کو پھیلا کر زندگی اور ثقافت کے سارے کینوس پر محیط کر دیا ہے۔۔۔ اُنہیں کیا معلوم کہ تہذیب کیا چیز ہے اور زندگی میں رنگا رنگی، رعنائی اور بوقلمونی کیسے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے جب ناچ دکھایا تو وہ دم بخود رہ گئے اور جب ناچ اپنے عروج پر پہنچا تو عجب بے ڈھنگے طریق سے خود بھی اس میں شریک ہو گئے۔۔۔ چنانچہ ہم نے پہلے اُن کی دھن دولت، پھر ڈھور ڈنگر اور آخر میں اُن کی بیویاں بھی ہتھیا لیں۔۔۔ دراصل ہماری تہذیب تو ایک جادو تھا۔ اس میں ایک نشے کی سی کیفیت تھی اور جو کوئی اس کے قریب آتا تھا، پھر اس کے دام سے باہر نہیں جا سکتا تھا......انہوں نے ہماری تہذیب کو ڈائن کا لقب دیا اور کہا کہ جب کبھی ڈائن نظر آئے یا تمہیں عقب سے بلائے تو پلٹ کر نہ دیکھنا، ورنہ تم پتھر کے بُت میں تبدیل ہو جاؤ گے۔۔۔ تم ہمیں چوری سے باز رہنے کا اپدیش دیتے ہو۔ یوں کیوں نہیں کہتے کہ ہم اپنے سارے ثقافتی سرمایے ہی سے قطع تعلق کر لیں۔ چوری سے کوئی سروکار نہ رکھنے کا یہ مطلب بھی تو ہے کہ ہم اپنی ذات، اپنی انفرادیت، اپنے مزاج کو تج کر بالکل ننگے ہو جائیں۔''(۱۳)

ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں تہذیبی رجحان اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی تحریروں میں تہذیبی رَو چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس میں انہوں نے ''چوری'' کو تہذیبی پہلو قرار دیا ہے۔ اسی سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے آریائی اور دراوڑی تہذیب کو بھی بحث میں شامل کر لیا۔ ''چوری'' کے اسباب اور پھر دوسری اشیاء پر اس کا اطلاق بھی بڑے فنکارانہ مگر سادہ اور سہل انداز میں پیش کر دیا۔ تہذیب کی جڑیں تلاش کرنے کے لیے افریشیا کی تہذیبوں کو بھی کھنگالا۔ ہند آریائی تہذیبوں کو بھی تفصیل سے بیان کیا۔ ہر چند کہ انشائیہ کے آخری حصے میں مزاح کے پیرائے میں ''چوری'' کو ہماری تہذیب کا عنصر بتایا اور کہا کہ ''چوری'' سے دستبردار ہونا اپنی تہذیب وثقافت سے ہاتھ دھونے کے مصداق ہے۔ اگر سنجیدگی سے سوچا جائے تو یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ چوری کسی نہ کسی طرح ہماری روح کے اندر اُتری ہوئی ہے۔ اس حوالے سے اگر چوری سے باز رہا جائے گا تو ہماری تہذیب اور ثقافت ابدی نیند سو جائے گی۔

>''یوں بھی تقسیم کا وصف شاید عورت کی فطرت میں شامل ہے۔ جس طرح دھرتی ایک بیج کو سینکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہے اور درخت خود کو لاکھوں شاخوں اور پتوں میں بانٹ دیتا ہے، بعینہ عورت ازل سے اپنے گھر کو کوٹھڑیوں اور سامان کو پوٹلیوں میں تقسیم کرتی آئی ہے۔۔۔ دوسری طرف سیاح نہ تو سماج کا محافظ ہے اور نہ سامان کا رکھوالا۔ وہ تو سر سے پاؤں تک ایک ''باغی'' ہے یا کم از کم سماج کے بندھنوں اور دھاگوں سے متنفر ضرور ہے اور اب اپنے سماج اور گھر کو چوری چھپے خیر باد کہہ کر کھلی کائنات میں لمبے لمبے سانس لینے کے لیے نکل آیا ہے۔ چنانچہ وہ خود کو زمین کی کسی شے سے بھی وابستہ نہیں رکھتا۔ پہلے تو وہ ''ضروری سامان کو نذرِ نسیاں کرتا ہے پھر اپنے مخصوص لباس، گفتگو اور اندازِ نظر سے دست کش ہو جاتا ہے۔ آخر میں ذات پات، رشتے ناطے اور نام و نمود کے تمام نقوش سے بھی آزاد ہو جاتا ہے اور ملک فتح دین ٹمبر مرچنٹ کے طویل و عریض نام کے بجائے محض ایک ''سیاح'' کے نام سے پکارا جانے لگتا ہے۔ چونکہ سیاح کا لفظ مرتبے، نام اور شخصیت کی نفی کر دیتا ہے۔''(۱۴)

دھرتی کا لمس ڈاکٹر وزیر آغا کے تفکرات کا اٹوٹ عنصر ہے۔ ان کی نظم ''ماں'' میں ماں اور دھرتی کے تصور کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ہاں دھرتی اور ماں کا تصور ایک ساتھ اُبھرتا ہے۔ ''اُردو شاعری کا مزاج'' میں وہ عورت کو ٹھہرے ہوئے معاشرے کی مثال سمجھتے ہیں اور مرد کو آوارہ خرامی کی وجہ سے ''خانہ بدوش'' قرار دیتے ہیں جس طرح دھرتی ایک بیج کو سیکڑوں بیجوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ بالکل اسی طرح عورت بھی اپنے آپ کو بہت سے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ جب یہ بات طے ہے کہ اُن کے تفکرات میں تہذیب ایک چھتنار کی حیثیت رکھتی ہے تو ان کے انشائیے ابتدائی انسان کا ذکر، جنگلی تشبیہات، علاقوں اور الفاظ کا در آنا اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ وہ سیاح کو معاشرے کا باغی قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ سیاح گھر بار اور سماج کے بندھنوں سے آزاد ہوتا ہے۔ وہ چیزوں کو تعصب کی نظر سے نہیں بلکہ حسین مناظر کو اپنے اندر ضم کرنے والی نظروں سے دیکھتا ہے۔ اس میں ایک پہلو یہ نکلتا ہے کہ وہ ایک تہذیب کو تج رہا ہوتا ہے اور عین اسی وقت لاشعوری طور پر دوسری تہذیب کو اپنا رہا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا اختصاص یہ ہے کہ وہ تہذیبی تصادم میں پھنسے ہوئے فرد کو ہپناٹائز (Hapnatise) کر کے فطرت کی تہذیب سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔ انشائیہ ''چیخنا'' میں لکھتے ہیں:

>''سڑک پر چلتے چلتے آپ کو کسی کوٹھی کے لان میں گلاب کا ایک شرمایا ہوا پھول نظر آتا ہے (تمثیلی معنوں میں نہیں) اور آپ کی جمالیاتی حس آپ کو مجبور کر دیتی ہے کہ آپ طبعی شرافت اور تہذیبی برتری کو بالائے طاق (جو یہاں بالائے سڑک کے مترادف ہے) رکھ کر اس پھول کی طرف بھونرے کی طرح لپکتے چلے جائیں اور اس سے قبل کہ آپ کی جبلت اور فہم کے مابین تصادم کا آغاز ہو، آپ ایک ہی زقند میں گلاب کی کومل شاخ پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔''(۱۵)

ایک دوسرے انشائیے میں یوں مرقوم ہیں:

> ''لیکن یہ ''راہِ راست'' بھی تو ایک مفروضہ ہے۔ زندگی کی تو ساری لکیریں ہی ٹیڑھی ہیں۔ اسی سے تنوع اور رنگارنگی پیدا ہوتی ہے ورنہ سیدھی لکیر تو شاید سیدھی جہنم کو جاتی ہے۔ انہی ٹیڑھی میڑھی لکیروں پر ہم آپ شب و روز گامزن ہیں اور شکر ہے کہ گامزن ہیں۔ حجرے کے مولوی کی طرح کسی سیدھی لکیر کے رحم و کرم پر نہیں ہیں۔ میرا قصہ سنیے! جب کالج کی ہنگامہ خیزیوں اور ''آوارہ گردیوں'' سے میں اُکتا گیا تو میں نے ایک صبح جنگل کا رُخ کیا اور کسی نہ کسی طرح اپنے اس آبائی گاؤں کو ڈھونڈ نکالا جو آبادی سے کوسوں دُور، ایک سوئی ہوئی نہر کے کنارے چند اونگھتے ہوئے درختوں میں چھپا بیٹھا تھا...... اور اب پچھلے کئی برس سے اس شہر میں مقیم ہوں۔ میری رہائش گاہ ساتویں منزل کا دو سو بیسواں کمرہ ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے ساتھ والے دو سو اکیسویں نمبر میں کون صاحب رہتے ہیں۔ ان کی ملاقات کی ضرورت مجھے آج تک نہیں پڑی۔ انہیں بھی اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے کا کبھی خیال نہیں آیا۔''(۱۶)

ڈاکٹر وزیر آغا دیہاتی اور شہری تمدن میں فرق کرتے ہوئے دیہات کے کلچر کو سراہتے ہیں۔ دیہات فطرت کو روپوش نہیں کرتا جبکہ شہر فطری مناظر کو اپنی اُکتا دینے والی تیز رفتاری میں گم کر دیتا ہے۔ شہری تمدن میں بالکل ساتھ رہنے والے کے بارے میں بھی ایسی بے خبری کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ایک مدت کے بعد اپنے گاؤں جاتے ہیں اور وہاں کی تہذیب کو سنسان اور ویران دیکھتے ہیں۔ نہر جو سوکھ چکی تھی، کو سوئی ہوئی قرار دیتے ہیں۔ بوڑھے درختوں کو اونگھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہی احساس ایک ادیب یا شاعر کو ایک عام فرد سے الگ کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں دھرتی کا پیار جاگتا ہے۔ ان کے انشائیے میں رُتوں کا رس اسی دھرتی کی عطا ہے۔ اس کی نرم مٹی سے سفید چنبیلی چٹکتی ہے۔ پیلی سرسوں رنگ بکھیرتی ہے۔ سرخ گلاب تتلیوں کی صورت میں خوشبو اڑاتے ہیں۔ اس مشاہدے میں ان پر بہجت کی ایک مخصوص کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اس دُھن کو جو فطرت کی بالواسطہ عطا ہے اور ایک غنی صفت انسان کی طرح بے دریغ تقسیم کرنے لگتے ہیں۔(۱۷) ان کے انشائیوں کے باطن سے جو خوشبو اُٹھتی ہے اس کا مصدر وہ پھول، پھل اور پتے ہیں جو اس دھرتی سے پیدا ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا جتنے بڑے نقاد ہیں اُتنے بڑے انشائیہ نگار بھی ہیں۔ انہوں نے انشائیہ لکھتے وقت ایک سچے فنکار کا کردار ادا کیا ہے۔ ان کے لیے ماضی حال کا آئینہ اور مستقبل ایک لمحۂ حال ہے۔ مگر وہ اس آنے والے مستقبل کا ادراک رکھتے ہیں چنانچہ وہ علم، فن، زندگی اور اس کی جامعیت کو سمجھتے ہوئے ایک پُر امید اور حوصلہ افزا نتیجہ نکالتے ہیں۔ ان کے انشائیے تفکر اور علمی تبحر میں رچے ہوئے ہیں۔ اُن سے یاسیت کا پہلو نہیں نکلتا بلکہ رجائیت پسندی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ وہ کھیتوں کی سیر کرتے ہیں۔ فطرت پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ انشائیوں کے موضوع بھی تہذیب سے متعلق ہی رکھتے ہیں۔ ان کے کسی بھی انشائیے کا عنوان دقیانوسی نہیں ہے۔ انشائیہ

''چرواہا'' میں لکھتے ہیں:

> ''پچھلے ہفتے کی بات ہے میں حسبِ معمول کھیتوں کا طواف کر رہا تھا کہ میری ملاقات ایک چرواہے سے ہوئی ۔۔۔سو میں نے اس سے پوچھا: ''بھائی چرواہے! تم پہاڑیوں کی مہیب تنہائی میں پہاڑ ایسا دن کیسے کاٹ لیتے ہو''؟ میری بات سن کر وہ بے اختیار ہنسا۔ کہنے لگا: ''کون سی تنہائی آغا جی! میرے ساتھ بھیڑیں ہوتی ہیں پھر وہاں پہاڑیاں ہیں۔ پہاڑیوں پر جھاڑیاں ہیں۔ جھاڑیوں میں چڑیاں ہیں۔ میں تنہا کب ہوتا ہوں''! میں نے کہا: ''وہ تو ٹھیک ہے وہاں نہ بندہ ہوتا ہے نہ بندے کی ذات! آخر تم باتیں کس سے کرتے ہو''؟ وہ پھر ہنسا۔ کہنے لگا: ''جی باتوں کا کیا ہے وہ تو میں خود سے کر لیتا ہوں۔ اپنی آواز کو سننے میں بڑا لطف آتا ہے۔'' یہ کہہ کر چرواہا تو چلا گیا، مگر میں تادیر سوچتا رہا کہ واقعی تنہا وہ نہیں، ہم ہیں کیونکہ وہ تو ہمہ وقت اپنے ساتھ رہتا ہے جبکہ ہم دوسروں کے ساتھ رہتے ہیں......آج مجھے چرواہے کی بات میں ایک جہانِ معنی نظر آ رہا ہے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ تا حال انسانی تہذیب صرف تین ادوار سے آشنا ہوئی ہے...... ''پہلا چرواہے کا دور'' جو گزر چکنے کے باوجود ابھی تک نہیں گزرا۔ دوسرا کسان کا دور'' جو اپنی عمر طبعی گزر چکنے کے بعد اب جاں بلب ہے اور تیسرا ''بنیے کا دور'' جو ابھی ابھی شروع ہوا ہے۔ بنیے کی ساری قوت ''زر'' میں ہے''(۱۸)

انشائیہ نگار اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے سو طرح کے مضمون باندھ لیتا ہے۔ پیشِ نظر اقتباس میں بھی انہوں نے دیہی کلچر کو شہری کلچر پر ترجیح دی ہے۔ اس ساری اضطرابی کیفیت کو انہوں نے ایک چرواہے کی زبانی کہلوایا ہے۔ اصل زندگی تو اپنے ساتھ رہنا ہے جبکہ ہم ساری زندگی دوسروں کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔ اقتباس کے دوسرے حصے میں انسانی تہذیبوں کا ذکر ہے۔ بتایا گیا ہے کہ پہلی تہذیب چرواہے کی ہے، دوسری کسان کی اور تیسری تہذیب بنیئے کی ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ انشائیہ ساٹھ کی دہائی میں لکھا گیا ہے لہٰذا اس دور میں بنیئے کا ایک خاص مقام تھا۔ لوگ اس سے اپنی ضرورتیں پوری کر لیا کرتے تھے۔ یہ اس وقت کی تہذیب تھی۔ اب بنیئے کی جگہ مختلف کمپنیوں اور اداروں نے لے لی ہے۔ یہ اور تہذیب ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ''دستر خوان'' میں لکھتے ہیں کہ سچی بات تو یہ ہے کہ دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھانے کی روایت ہمارا عزیز ترین ثقافتی ورثہ تھا مگر افسوس کہ ہم نے اپنے اس ورثے کو رد کر دیا ہے۔ دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھانے کے تہذیبی اقدام کو کھانا کھانے کے نیم وحشی عمل میں بدل دیا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا انشائیہ ''حقہ پینا'' ہماری تہذیب و ثقافت کا آئینہ دار ہے۔ اس میں انہوں نے حقہ پینے کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا ہے اور کئی طرح کے تہذیبی رویوں کی نشاندہی کی ہے۔ یقین جانیے! تہذیبی حوالے سے اتنا گہرا تجزیہ آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ الفاظ کا چناؤ اور واقعات کی ترتیب یوں ہے جیسے پھول میں پتیاں ہوتی

ہیں۔ان الفاظ کے چناؤ اور ترتیب سے تہذیب وثقافت کی خوشبو آتی ہے۔اس انشائیے کا ایک ایک جملہ تہذیب و ثقافت کی خوشبو سے تر ہے۔طوالت مانع نہ ہوتی تو پورا انشائیہ آپ کی نذر کرتا لہٰذا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''میں خود حقّہ نہیں پیتا لیکن اگر میرے سامنے کوئی خوش بخت حقے سے رومان لڑا رہا ہو تو سو جان سے اس پر فدا ہو جاتا ہوں۔یہی نہیں بلکہ اس پر بلا وجہ اعتبار بھی کرنے لگتا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ سگریٹ نوش کی طرح سیمابی اخلاقیات کا نہیں بلکہ دیرپا انسانی قدروں کا حامل ہوگا۔کسی بھی شخص کے بارے میں اگر میرے رویے میں تبدیلی لانا مقصود ہو تو آپ اس کی مخروطی انگلیوں سے سگریٹ نکال کر ان میں حقے کی نے پھنسا دیں۔۔۔مثلاً جب حقے کی نَے آپ کے قریب بیٹھے ہوئے کرم فرما کے سیاہ، متعفن اور موٹے ہونٹوں کو چھو کر آپ کی طرف لوٹتی ہے اور آپ اسے ڈیٹول سے دھوئے بغیر اس پر اپنے نازک ہونٹ ثبت کر دیتے ہیں تو اس کا صاف مطلب ہے کہ آپ نے اس ایک تابندہ لمحے میں اپنے جملہ قبائلی، نسلی، خاندانی اور جماعتی تعصّبات کو ختم کر کے انسانی اخوت اور عالمی برادری کے احساس کو پروان چڑھا دیا......سگریٹ پینا اپنی انفرادیت بلکہ انا کا اظہار کرنا ہے جو فی زمانہ ایک قطعاً غیر مستحسن فعل ہے......حقہ دائرہ بناتا ہے اور دائرے کے اندر ہی رواں دواں ہوتا ہے جبکہ سگریٹ خطِ مستقیم بناتا ہے اور پھر اپنے ہم زاد کو ساتھ لیے دوریوں میں کھو جاتا ہے۔اس اعتبار سے دیکھیے تو حقہ پینا ایک سماجی عمل ہے جبکہ سگریٹ پینا سماج سے انحراف کی طرف پہلا قدم۔چنانچہ اسی لیے میں حقہ نوش کو سگریٹ نوش کے مقابلے میں کہیں زیادہ منجھی ہوئی اور مہذب شخصیت قرار دیتا ہوں......حقہ سگریٹ کی اس سادگی پر ہمیشہ سے خندہ زن رہا ہے۔وجہ یہ کہ وہ خود ایک ایسی پیچیدہ مشین ہے جو نہ متعدد پرزوں سے مل کر مرتب ہوتی ہے بلکہ کام بھی سائنسی اصولوں کے تحت ہی کرتی ہے۔حقہ کا وہ نچلا حصہ جسے ریڈی ایٹر کا نام ملنا چاہیے، پانی سے لبالب بھرا ہوتا ہے اور کائنات کے ان ابتدائی ایام کی یادگار ہے جب چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔اسے حقے کا ''اجتماعی لاشعور'' بھی کہا جا سکتا ہے......لیکن ہر بار جب وہ حقے کو تازہ کرتا ہے تو صدیوں پرانے اس (Ritual) ہی سے گزرتا ہے جو پانی کے ذریعے طہارت کا اہتمام کرتا آیا ہے۔مراد یہ کہ حقہ پینے والا حقے کو گنگا اشنان ایسے عمل سے پوتر کرتا ہے اور پوتر کرتے ہوئے کچھ منتر بھی اُگلتا ہے......اگر حقہ پینے والا چلم میں اُپلے کی آگ رکھے گا تو حقے کے کش میں بھینس کے دودھ کی حلاوت از خود پیدا ہو جائے گی اگر وہ لکڑی کے کوئلے سجائے گا تو اس درخت کی نسبت سے جس کی لکڑی استعمال ہوتی ہے، حُقّے کے کش میں بھی ایک خاص قسم کی کڑواہٹ یا شیرینی محسوس ہوگی......حقہ پینے سے پہلے یہ سارا اہتمام حقہ نوشی کے عمل میں گہرائی پیدا کرتا ہے اور انسان کو بڑے بڑے حقہ نوشوں کی روحوں سے براہ راست ہم کلام ہونے کے سنہری مواقع فراہم کرتا ہے۔''(۱۹)

پیش کردہ اقتباس کچھ طویل ہے مگر ڈاکٹر وزیر آغا کے تہذیبی وثقافتی پہلو کو واضح کرنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ انہوں نے حقے کوایک دائروی اور سماجی عمل جبکہ سگریٹ کوانفرادی اور معاشرے سے انحرافی عمل قرار دیا ہے۔حقہ ہرطرح کے تعصّبات اور ناچاکیوں کوختم کرنے میں مدد کرتا ہے۔ایک فرد کودوسرے فرد کے ساتھ جوڑتا ہے اور بالآخر تمام افرادِ معاشرہ کوایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کرتا ہے۔اس کے برعکس سگریٹ ایک خطِ مستقیم کے عمل کو وجود میں لاتی ہے اور پھر افرادمعاشرہ کومنتشر کردیتی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا مزید کہتے ہیں کہ حقہ ہماری ثقافت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے جبکہ سگریٹ کسی اور معاشرے کی علمبردار ہے۔جس طرح محبت میں سوسوجتن کرنے پڑتے ہیں بالکل اسی طرح حقہ تازہ کرنے کے لیے قدیم روایات اور تہذیبی ادوار میں سے گزراجاتا ہے جبکہ سگریٹ کی سادگی دیکھیئے کہ ایک کاغذ میں تمبا کو لپیٹا اور سلگانا شروع کردیا۔حقہ ایک سائنسی اور پیچیدہ مشین ہے۔ڈاکٹر صاحب موصوف نے حقے کے نچلے حصے کو''اجتماعی لاشعور'' کا نام دیا ہے اور اس لبالب پانی سے کائنات کی ابتدائی حالت کوبھی بیان کردیا ہے کہ ابتداء میں ہرطرف پانی ہی پانی تھا اور اسی سے زندگی ابتدا ہوئی۔مزید یہ کہ حقہ نوشی انسان کے عمل میں گہرائی پیدا کرتا ہے اور انسان کوانسانی روحوں سے ملنے کا سبب بنتا ہے۔یہ بات کاغذی پیکروں یعنی سگریٹوں میں کہاں ہوتی ہے۔بلاشبہ اس انشائیے میں مزاح کا عنصر بھی شامل ہے مگر یہ انشائیہ سنجیدگی اختیار کرنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے تہتر (۷۳) انشائیے سپرد قلم کیے ہیں۔ان سب پر تفصیل سے بات کرنا مضمون نہیں بلکہ ضخیم کتاب کا تقاضا کرتا ہے لہٰذا اُن کے صرف چند تہذیبی انشائیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ان کے انشائیوں کے عنوانات بھی اسی تہذیب کے پروردہ ہیں۔انشائیوں میں ان کا تہذیبی رویہ اور فطرت کے ساتھ لگاؤ بار بار اُبھرتا دکھائی دیتا ہے۔تہذیب اُن کی شخصیت کا ایک خاصا ہے لہٰذا انہیں یہ ادراک حاصل ہے کہ وہ تہذیبی وثقافتی عناصر کواپنے انشائیے میں سموسکیں۔

اُن کے انشائیوں میں دسترخوان، سیاح، چیخنا، جہاں کوئی نہ ہو، پگڈنڈی، چوری سے یاری تک، چرواہا، غلامی، بارہواں کھلاڑی، فٹ پاتھ اور حقہ پینا، واپسی، کچھ ضرب المثل کی مخالفت میں، کچھ قلم کے بارے میں، عریانی، کھلونے، کچھ ''اپنوں'' کے بارے میں، آزادی اور نروان بالعموم اُن کے تہذیبی وثقافتی نظریات کی نمائندگی کرتے ہیں۔شمس الرحمان فاروقی کے خیال میں وزیر آغا صرف ادیب ہی نہیں بلکہ ادیب گر بھی ہیں۔(۲۰) شاہد شیدائی کہنا ہے کہ وزیر آغا نے انشائیے تخلیق کرنے کے علاوہ، اس صنف ادب کی تفہیم اور اس کے خدوخال واضح کرنے کے لئے بے شمار مقالے بھی تحریر کیے ہیں اور نئے لکھنے والوں کی تربیت میں بھی اہم فریضہ انجام دیا ہے۔(۲۱) ان کے انشائیے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں فکری موشگافیوں اور نکتہ آفرینی کے عناصر بیشتر انشائیہ نگاروں سے زیادہ ہیں۔وہ ایک نکتے کو دوسرے نکتے سے اس طرح ملاتے ہیں کہ ایک تہذیبی وحدت پیدا ہوجاتی ہے اور یہ وحدت اُن کے نظریات کو بہ طریق احسن قاری کے سامنے رکھ دیتی ہے۔اب یہ قاری پر مشتمل ہے کہ وہ اُن کے افکار وخیالات کو کس رَو کا نتیجہ سمجھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مشتاق احمد یوسفی، پیش لفظ ''چوری سے یاری تک'' از وزیر آغا، جدید ناشرین، لاہور، س۔ن، ص۱۰

۲۔ حیدر قریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت''، نایاب پبلی کیشنز، لاہور، طبع اول، ۱۹۹۵، ص ۱۳۲

۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر ''انشائیہ کے خدوخال''، طبع اول، مکتبہ فکروخیال، لاہور، ۱۹۹۰، ص ۲۳

۴۔ جانسن، ڈاکٹر، بحوالہ لطیف ساحل، ''اردو انشائیہ کے ابتدائی نقوش''، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، طبع اول، ۱۹۹۴، ص۱۰

۵۔ ایضاً، ص۱۰

۶۔ الیگزینڈر سمتھ، بحوالہ لطیف ساحل، ''اردو انشائیہ کے ابتدائی نقوش''، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، طبع اول، ۱۹۹۴، ص ۱۲

۷۔ جمیل آذر، پروفیسر، انشائی تنقید، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۹، ص ۱۶

۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر ''انشائیہ کے خدوخال''، ص۹، ۱۰

۹۔ مشتاق احمد یوسفی، فلیپ، ''چوری سے یاری تک''،

۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر ''ڈاکٹر وزیر آغا۔ایک مطالعہ''، مکتبہ اسلوب طبع اول، کراچی، ۱۹۸۳، ص ۸۴۔۸۵

۱۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، پیش لفظ ''سمندر اگر میرے اندر گرے''، مکتبہ فکروخیال، لاہور، طبع اوّل، ۱۹۸۹، ص ۱۹

۱۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر ''چوری سے یاری تک''، ص ۱۱تا۱۹

۱۳۔ رشید امجد، ڈاکٹر ''وزیر آغا کی انشائیہ نگاری''، مطبوعہ، کاغذی پیرہن، مارچ، اپریل ۲۰۱۱، ص ۳۹

۱۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر ''چوری سے یاری تک''، ص ۲۲ تا ۲۸

۱۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر ''چوری سے یاری تک''، ص ۳۱، ۳۲

۱۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر ''چوری سے یاری تک''، ص ۴۳

۱۷۔ انور سدید، ڈاکٹر ''ڈاکٹر وزیر آغا۔ایک مطالعہ''، ص ۸۵

۱۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر ''سمندر اگر میرے اندر گرے''، ص ۲۵۔۲۶

۱۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر ''حقہ پینا، مشمولہ، دوسرا کنارہ''، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، طبع اول، ۱۹۸۲، ص ۲۵۔۳۵

۲۰۔ شمس الرحمان فاروقی، مطبوعہ، سہ ماہی، اسالیب، ڈاکٹر وزیر آغا نمبر، سرگودھا، ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۱، ص ۱۲۷

۲۱۔ شاہد شیدائی، اختتامیہ ''گِک ڈنڈی''، از ڈاکٹر وزیر آغا، دوسرا ایڈیشن، اظہار سنز، لاہور، س۔ن، ص ۳۷۹